سائنس

فکرِ اقبال اور مطالعۂ سائنس کی ضرورت

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
اقبال اکادمی پاکستان
©2002-2006

ڈاکٹر عبدالحمید شیخ

سائنس کی بدولت ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے، قابلِ اعتماد ہوتا ہے، کیونکہ ہم اس کی تصدیق و توثیق کر سکتے بلکہ اس سے کام لیتے ہوئے حوادثِ فطرت پر تصرف بھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ سائنس کے یہاں حقیقت کا کوئی باقاعدہ نظریہ نہیں۔

اس کے یہاں کچھ ہے تو اس کے الگ الگ اجزا کے الگ الگ تصورات جن کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں جُڑتا۔ یُوں کہنے کو سائنس کا موضوع مادہ بھی ہے، حیات اور نفس بھی، لیکن جہاں آپ نے یہ سوال کیا کہ مادہ، حیات اور نفس کو باہم کیا تعلق ہے تو حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اِن سے جن علوم میں بحث کی جاتی ہے ان کی حیثیت محض ٹکڑوں کی ہے۔ لہٰذا وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس سوال کا کوئی مکمل جواب دے سکیں۔ میرے نزدیک علوم طبیعی کی مثال زاغ و زغن کی ہے جو فطرت کے مردہ جسم پر جھپٹتے اور اس کا ایک آدھ ٹکڑا نوچ لے جاتے ہیں۔

(علامہ اقبالؒ)

لفظ "سائنس" سے فوراً ہی ذہن میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے وابستہ دو مختلف تصور ابھرتے ہیں جن میں سے ایک خیر خواہی پر اور دوسرا سراسر تباہی پر مبنی ہے۔

اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں سائنس نے جس قدر عروج حاصل کیا، وہ آج کے حساب سے بے حد کم تھا۔ البتہ اُس وقت جو مادی ترقیاں منظرِ عام پر آئیں، ان کے فلاحی پہلو نسبتاً زیادہ تھے۔ وہ زمانہ جدید سائنس کے دور کا آغاز تھا۔ سائنس کی دنیا میں دھڑا دھڑ نئے نئے نظریات پیش ہو رہے تھے لیکن ان نظریات کی تصدیق اور ان کے اطلاقی پہلو ابھی تجرباتی مراحل میں تھے۔ کسے معلوم تھا کہ الف لیلوی داستانوں اور دیومالائی قصوں میں موجود وہ عنصر جسے سائنس فکشن کہا جاسکتا ہے، اس کا کچھ حصہ، اپنے خاص انداز سے حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ یعنی انسان زمان و مکان کی قیود سے بھی آزاد ہونا شروع ہو جائے گا اور پلک جھپکنے میں دنیا کو بھسم کرنے کے قابل بھی ہو سکے گا۔

اگر تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہر تہذیب اپنے عروج پر پہنچ کر زوال کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس زوال میں قدرتی آفات کا بھی ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس کے اسباب زیادہ تر انسان کے اپنے ہاتھوں کے پیدا کیے ہوتے ہیں۔ گویا ہر تہذیب کم و بیش اپنے ہی ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک تہذیب کے بتدریج خاتمہ کے ساتھ ساتھ جو دوسری تہذیب آہستہ آہستہ جنم لیتی ہے، وہ پہلی سے مختلف ہوتی ہے اور اس کی شکل و صورت منجملہ دیگر اسباب کے نئے حاکموں کے اندازِ فکر کی تابع ہوتی ہے۔ مغلوں کے زوال کے بعد یہی صورتِ حال جنوبی ایشیا میں بھی پیش آئی۔ انگریز آیا تو اپنے ساتھ اپنی تعلیم، زبان اور ثقافت بھی لے کر آیا تھا اور انہیں جنوبی ایشیا کے ملکوں پر کچھ اس طرح مسلط کیا کہ وہ

آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہے۔ چونکہ انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، لہٰذا انہیں ہر قیمت پر زیر رکھنا اُن کی اوّلین کوشش تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت، اقدار، رسوم و رواج، غرض ہر وہ چیز جو اپنے اندر اچھے پہلو رکھتی تھی، اسے باعثِ تمسخر بنا دیا۔ اور اگر کوئی چیز باقی رکھی تو وہ بے معنی مشاعرے، عیش و طرب کی محفلیں اور اسی قبیل کی دیگر سرگرمیاں تھیں۔

مسلمانوں کی انگریز سے نفرت محض اس لیے تھی کہ انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھین کر انہیں اپنا غلام بنایا۔ ہندوؤں کا کیا تھا۔ وہ پہلے مسلمانوں کے غلام تھے، پھر انگریز کے غلام بن گئے لہٰذا انہوں نے مسلمانوں سے بغض کے طور پر انگریز کی طرف اپنا دستِ تعاون بڑھایا تاکہ ان کی مدد سے وہ مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر لیں یا پھر انہیں اپنا دستِ نگر بنا لیں۔

دوسری جانب انگریز نے بھی صدیوں سے غلام ہندوؤں کو ابھارا اور انہیں سیاست اور تجارت میں اپنا شریک بنا لیا۔ انگریز سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو ان سے دُور رکھا۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں کے ساتھ مل کر ہندو بھی مسلمانوں پر تعلیمی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے چھاتے چلے گئے اور ثانوی حکمران کے طور پر ابھرے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا انہوں نے نہ صرف یہ کہ انگریز کی لائی ہوئی تہذیب سے نفرت کی بلکہ انگریز کے لائے ہوئے مغربی علوم کو بھی اسلامی علوم کی ضد قرار دیا۔ ان میں سرِفہرست سائنسی تعلیم تھی جو اپنے اخلاقی پہلوؤں کے لحاظ سے شیطانی متصوّر ہوئی۔ مثال کے طور پر اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ جب لاؤڈ سپیکر ایجاد ہوا تو اسے اس لیے شیطانی کہا گیا کہ اس کے ذریعے آواز بلحاظ شدت اور فاصلہ منہ سے نکلی ہوئی قدرتی آواز کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اسی بنا پر مغرب کے سائنسی علوم کچھ علما کے نزدیک ملحدانہ ٹھہرے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے کہ سائنسی علوم کو اسرارِ الٰہی کو جاننے کی ایک کوشش کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لفظ اسرار سے البتہ یہ تاثر ابھر سکتا ہے کہ سائنس کی مدد سے انسان ان چیزوں کو جاننا چاہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھید ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے بھید پا لے لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ جن اسرار کو خدا نے انسان سے مخفی رکھا ہے وہ انسان کے ہاتھ لگ جائیں۔ انسانوں کو تو صرف وہی کچھ معلوم ہو سکتا ہے جو باری تعالیٰ نے اس کے جاننے کے لیے رکھ چھوڑا ہے اور بالکل یہی وہ حصہ ہے جس میں سے انسان اپنی عقل و فہم سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں کسی قدر کامیاب ہوا

ہے۔ بلکہ ابھی کافی حد تک ناکام ہے۔ علم میں از خود کوئی برائی نہیں اور اگر ہے تو اس کے طرزِ استعمال میں منفی اثرات کے لحاظ سے ہے۔ ذرّہ Atom اپنے اندر جو بے پایاں قوت رکھتا ہے وہ انسان کی عطا کردہ نہیں بلکہ منجانب اللہ ہے۔ البتہ اس قوت کو حاصل کرنے کا طریقہ جان کر اسے انسانی فلاح یا ہلاکت کے لیے استعمال کرنا انسان کا کام ہے۔

علم پر کبھی بھی کسی ایک قوم یا ملک کی اجارہ داری نہیں رہی جس نے اسے حاصل کرنے کی جسقدر سعی کی، اس نے اسے اسی قدر پایا۔ علم اپنا سفر طے کر کے یونانیوں تک پہنچا۔ ان سے مسلمانوں نے حاصل کیا اور مسلمانوں سے اہلِ مغرب نے۔ ہر ایک نے نہ صرف یہ کہ ان علوم میں گراں قدر تراجم و اضافے کیے بلکہ اپنی اپنی سوچ، تحقیق اور ضرورت کے مطابق علم کی مختلف شعبوں میں سے کچھ کو آگے بڑھایا۔ اور کچھ کو ایک حد تک نظر انداز کر دیا۔ جب مختلف علوم اہلِ مغرب تک پہنچے تو انہوں نے اپنی زیادہ تر توجہ علم کے مادی پہلوؤں پر دی اور پھر جہاں جہاں ممکن تھا وہاں وہاں ان علوم کو قاعدوں، کلیوں اور نظریات کی صورت میں منضبط کیا۔ جنوبی ایشیا کے برعکس کہ جہاں علم خواص تک محدود تھا اور سینہ بہ سینہ چلتا تھا بلکہ ابھی تک چل رہا ہے، انہوں نے علم کو عام کر کے ہر ایک کو دعوتِ فکر دی جس کے نتیجے میں مختلف قسم کی ایجادات و اختراعات وجود میں آئیں۔ صنعتی انقلاب آئے اور اس طرح انسان، مشینی دور میں داخل ہوا جس نے قوموں کی اقتصادی حالت بدل دی اور پھر اس کی بنا پر ہر قوم نے دوسری پر سبقت حاصل کرنے کے لیے تجارت پر زور دیا۔ تجارتی منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی اور ساتھ ساتھ ان جگہوں کی بھی جہاں سے خام مال دستیاب ہو سکے۔ یہ سب صنعتی انقلاب کے منطقی نتائج تھے جن کے نتیجے میں انگریز جنوبی ایشیا میں تجارت کے بہانے داخل ہوا اور پھر اپنی مخصوص سیاست کے ذریعہ اس خطۂ زمین پر اپنا قبضہ جمالیا۔ دوسری مغربی اقوام نے بھی یہی راہ اپنائی اور اس طرح نہ صرف یہ کہ انہوں نے غیر صنعتی دنیا کی بندر بانٹ کر لی بلکہ اپنے اپنے مفادات کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی ہوئے۔ ان عوامل کے زیرِ اثر طاقتور اور کمزور کی تقسیم و تفریق عمل میں آئی۔

گذشتہ زمانے میں بھوکوں مرنے والے اپنی روزی کی تلاش میں کھاتے پیتوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اس کے برعکس اب بھوکوں پر کھاتے پیتے ٹوٹ پڑے۔ اس طرح ملکوں کی تسخیر عمل میں آئی۔ حاکم ملکوں میں سرمایہ دارانہ اور محکوم ملکوں میں جاگیردارانہ نظام قائم ہوئے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت طاقت کے منبعے تبدیل ہو گئے، دنیا میں فوجی قوت لازم قرار پائی اور کمزور ملک ہمیشہ کے لیے طاقتور

ملکوں کے رحم وکرم پر آگئے۔ پہلے تو محض فوج کشی سے ایک قوم دوسری پر غلبہ پالیتی تھی، اب یہی کام تجارت نے بڑی خاموشی سے انجام دینا شروع کیا اور آجکل یہ کام فوجی چھتری تلے سیاست کے نام پر ہو رہا ہے۔ ان سب کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ طاقتور ملکوں نے خود کو ترقی یافتہ اور کمزور ملکوں کو غیر ترقی یافتہ کہا، پھر ترقی پذیر کا نام دے کر انہیں خوش کر دیا۔ اس کے بعد انہیں تیسری دنیا جیسے بے معنی لقب سے نوازا۔

مذکورہ صنعتی انقلاب کے زیر اثر جب مغربی تہذیب جنوبی ایشیا میں نمودار ہوئی تو اس کا سامنا اس ملوکیت سے ہوا جو یورپ کے متحرک معاشرہ سے بے خبر اپنی خود ساختہ قدروں کو سینے سے لگائے محوِ خواب تھی۔ انتہا یہ ہے کہ جب برطانیہ، جرمنی، فرانس اور دیگر مغربی اقوام کے سائنسدان اپنی اپنی ایجادات اور سائنسی نظریات کو رسائل وجرائد کے ذریعے ایک دوسرے تک پہنچا رہے تھے، بڑی بڑی سائنس اکادمیاں اور تجربہ گاہیں قائم کر رہے تھے، اُس وقت جنوبی ایشیا کے رہنے والے ان سب سے نابلد، گل وبلبل کی دنیا میں غرق تھے۔ انفرادی طور پر اگرچہ کچھ لوگ ریاضی، فنِ تعمیر اور حکمت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے مگر صد افسوس کہ یہ علوم استاد سے اس کے کسی شاگردِ خاص کو تو منتقل ہوتے مگر ادارہ کی سطح پر عوام کی دسترس سے باہر رہے اور علم کا شوق رکھنے والوں کو محض مروجہ تعلیم ہی ملی۔ مغربی تعلیم جب اس خطہ میں متعارف ہوئی تو انگریز دشمنی کی بنا پر اسے رد کر دیا گیا۔ سائنس سے نفرت کی حد یہ تھی کہ اس کے اثرات کے تحت ہم اب تک یہ ثابت کرتے پھرتے ہیں کہ اسلام اور سائنس ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ انسان نے چاند پہ قدم رکھ لیا ہے اور ہم میں سے بہتوں کو اس کی صداقت ہی پر شک میں ڈال دیا گیا بلکہ یقین کرنے والوں کو کافر تک کہا گیا۔ اگر آج سائنس دشمنی کا یہ حال ہے تو آج سے سو سال پہلے کے حالات خدا ہی جانے کیا ہوں گے؟

مسلمانوں کو ان کی اس زبوں حالی سے نکالنے کے لیے جو مفکرین ابھرے ان میں سرسید احمد خاں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

حاکم کو بدلنے کے لیے اس کی نفسیات سے آگاہ ہونا پڑتا ہے اور اسے اس کی زبان میں شکست دینا پڑتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا ہی درکار ہوتا ہے۔ اسی سوچ کے پیشِ نظر سرسید نے زور دیا کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کو بھی مغربی علوم اور تہذیب وتمدن کا مطالعہ کرنا چاہیے یہ بات علیحدہ ہے کہ انگریز کی لائی ہوئی تعلیم اپنانے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اسے

انگریز تک اپنی رسائی کا ذریعہ بنایا۔ اس طرح اُن کے آلہ کار اور اپنے وطن کے غدار بنے۔ ایسے لوگوں کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آیا جس نے یہ تاثر دیا کہ سرسید کی سوچ پر عمل مسلمانوں کو اپنے دین، ثقافت اور علوم و فنون سے بیگانہ کر دے گا۔ لہٰذا انہوں نے سرسید کی بھرپور مخالفت کی اور اپنی ڈگر پر قائم رہنے کے لیے ایسے اداروں کی بنیاد رکھی کہ جن کے ذریعے سائنسی علوم کے مطالعہ کو دین کے لیے زہرِ قاتل باور کرایا گیا۔

چنانچہ سرسید کی کوششیں بے پناہ مزاحمت کا شکار ہوئیں اور مسلمان اس تیز رفتاری سے آگے نہ بڑھ سکے جس رفتار سے ہندو بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بہرحال سرسید کے خیالات کی تائید کرنے والے بھی کم نہ تھے۔ انہوں نے سرسید کی سوچ کو آگے بڑھایا اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی علی گڑھ میں قائم درس گاہوں کے طرز پر تعلیمی ادارے قائم کیے۔ سرسید کے کام کو مولانا حالی نے اپنی بامقصد شاعری کے ذریعے آگے بڑھایا اور اس ذریعہ سے انھوں نے مسلمانوں کی بہتری کا جو نقشہ پیش کیا وہ مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

یہی وہ ماحول تھا جس میں علامہ اقبال نے ہوش سنبھالا۔

مغرب کی آزاد فضاؤں میں بسلسلہ تعلیم رہ کر علامہ مرحوم، حاکموں اور محکوموں کی تہذیب و تمدن کا تقابلی جائزہ لے چکے تھے۔ وہ مغربی تہذیب کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اشتراکی نظام کو ابھرتے دیکھا۔ انہوں نے ترکوں کی شکست کے بعد ملتِ اسلامیہ کے بکھرتے ہوئے شیرازے کے اسباب کا بھی جائزہ لیا۔ انہوں نے کلیسا کی رجعت پسندی کی بنا پر دین و سیاست کی باہمی علیحدگی کے اثرات بھی دیکھے۔ تاریخِ عالم کے مطالعے سے انہیں معلوم ہوا کہ اگر جذبات اور عقیدے، حقائق کی جگہ لے لیں تو پھر کچھ اہلِ حق و دانش گوشہ نشینی پر کیوں مجبور ہو جاتے ہیں ـــــ اور پھر ان گوشہ نشینوں میں سے جب کچھ لوگ خانقاہی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں تو پھر کیا ہوتا ہے؟

علامہ اقبال میں سرسید اور حالی کے خیالات کا حسین امتزاج تھا اور وہ ایک اعلیٰ پائے کے فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے شاعری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنا کر ملتِ اسلامیہ کو خوابِ خرگوش سے جگایا اس کے ساتھ ساتھ سیاست میں حصہ لے کر اپنا عملی حق بھی ادا کیا۔ مغربی معاشی نظام پر علامہ کے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ انہوں نے شدت سے محسوس کیا کہ اسلام ہی وہ واحد نظامِ حیات ہے

جو سرمایہ داری اور اشتراکی نظام کے بین بین ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ انسان کو معاشی تنگدستی سے نجات دلاتا ہے بلکہ اسے عزت و احترام کے منصب پر بھی بٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ ہائے کار کے اندر رہتے ہوئے بھی آقا اور غلام ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

مساوات سے مراد یہ نہیں کہ سب سے مادی دولت چھین کر اسے کُل افراد پر تقسیم کر دیا جائے بلکہ اس سے مراد اسلامی قوانین کا امیر و غریب یا طاقتور اور کمزور کے فرق کو بالائے طاق رکھ کر سب پر مساوی اطلاق ہے۔

معروف سائنس کی دنیا میں عشق و مستی نام کی کوئی شے نہیں۔ وہاں جو چیز چلتی ہے اُسے عقل و خرد کہتے ہیں۔ کچھ ناقدین کی طرف سے علامہ اقبال پر یہی اعتراض ہے کہ انہوں نے عشق کے مقابلے میں عقل کو کمتر کہا جبکہ قرآن حکیم میں جگہ جگہ انسان کو تدبر اور غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے جو عقل و خرد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ علامہ نے جس عشق کا ذکر کیا ہے وہ از قسم قلندری یا درویشی ہے جس کا تعلق سائنس سے نہیں بلکہ احکامِ الٰہی کی پاسداری سے ہے۔ مزید براں مذکورہ عشق سے علامہ کی مراد مجذوبیت نہیں کہ جس کیفیت کے تحت بعض کے نزدیک شرعی احکام کی پابندی بھی لازم نہیں۔ علامہ ایک ہوش مند انسان سے مخاطب ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انسان چونکہ بنیادی طور پر کئی لحاظ سے کمزور واقع ہوا ہے لہٰذا اپنے اعمال کی قباحت چھپانے کے لیے وہ دلائل کا سہارا لیتا ہے اور اس طرح وہ اپنی ضرورت کے مطابق حق کو باطل اور باطل کو حق بنانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ عشق میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے ایسی عقل و خرد کو عشق کے مقابلے میں عیار کہا۔ دوسرے لفظوں میں حضرت علامہ نے عشق کے مثبت پہلو کو عقل کے منفی پہلو پر ترجیح دی۔

اس امر کے ثبوت میں علامہ کی نثری تحریریں گواہ ہیں کہ عقل ہی کو بنیاد بنا کر سیاسی اور مذہبی مسائل پر انہوں نے اپنے افکار پیش کیے ہیں۔ شاعری میں چونکہ خیالات کی تفصیلی وضاحت کی گنجائش نہیں ہوتی اور پھر نہ صرف یہ کہ شاعری کا اسلوب نثر سے جدا ہے بلکہ اس میں بسا اوقات غلو سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے ناقدین کو اعتراض کرنے کے لیے خاصا مواد ہاتھ آجاتا ہے۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان اگر عقل سے صحیح اور جائز کام لے تو انسان، اگر اس سے کام ہی نہ لے تو حیوان اور عقل کا ناجائز استعمال کرے تو شیطان۔ حق بات تو یہ ہے کہ عشق بھی عقل کے بغیر ممکن نہیں۔ چونکہ سائنس کے مطالعہ میں دخل بھی عقل و خرد کو ہے اس لیے فکرِ اقبال کے

حوالے سے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار ضروری معلوم ہوا۔

سائنس دان چیزوں کو اُن کے مادی رنگ میں دیکھتا ہے۔ مختلف مشاہدات کی توجیہ کے لیے وہ اپنے نظریات پیش کرتا ہے جو بسا اوقات کچھ پیش گوئیوں کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ چیز خارجی ہوتی ہے اس لیے عملی تجربہ گاہ میں اس کے نظریات کی تصدیق یا تردید ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مفکر کچھ چیزوں کو ان کے ممکنہ غیر مادی رنگ میں دیکھتا ہے اور ان کی بابت اس کے نظریات ایک خاص کیفیت کے تحت اس کے اندر کی مشاہدہ گاہ کے ذریعے تشکیل پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے نظریات داخلی ہوتے ہیں۔

چونکہ ان نظریات کی دوسروں تک عملی ترسیل ممکن نہیں ہوتی اس لیے ان کی تصدیق یا تردید بھی ممکن نہیں تاوقتیکہ ویسی کیفیت دوسروں پر طاری نہ ہو۔

واردات قلبی سے متعلق مسائل کو چھوڑ کر کچھ ایسے بھی مسائل ہیں کہ جن پر ایک مفکر کھل کر اپنا اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ مثلاً زمان و مکان کے مسائل پر سائنس دانوں نے بھی اپنے نظریات پیش کیے اور فلسفیوں نے بھی۔ ایک نے مادہ اور توانائی کے حوالوں سے بحث کی اور دوسرے نے مابعد الطبیعاتی سطح پر جذبہ، وجدان اور ادراک کے ذریعے "ہے" اور "نہیں ہے" کی اصطلاح ہیں۔ یعنی دونوں کی منزل تو ایک رہی اور ہر ایک نے دوسرے کے خیالات سے استفادہ بھی کیا مگر راستے جدا جدا رکھے۔ قصہ مختصر جس طرح خیالات کے اظہار کے لیے نظم اور نثر کے تقاضوں میں فرق ہے اسی طرح کا فرق ایک صحیح مفکر اور سائنسدان کی سوچ میں ہوتا ہے۔

مفکروں میں ایک زینو ایلیائی بھی تھا کہ جس نے اپنے دلائل سے متحرک کو ساکن کیا اور دوسرے علامہ اقبال ہیں جنہوں نے متحرک کو متحرک ہی کہا اور اس طرح ممکن کو ناممکن نہ کہہ کر انہوں نے انسانی ترقی کی راہیں مسدود نہ کیں۔

کبھی فنِ تاریخ نویسی محض یہ تھا کہ واقعات کو ایک ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے اور اب جو اسلوب ہے اس میں انہیں واقعات کو اس زمانہ کے سماجی، اقتصادی، مذہبی، قومی اور بین الاقوامی تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے فنِ تاریخ نویسی سائنسی بنیادوں پر استوار ہو چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جب علامہ اقبال انسانی ارتقاء، مذہبی امور، زمان و مکاں وغیرہ کے مسائل پر بحث کرتے ہیں تو وہ ان تمام مفکرین کی آراء پر بھی بحث کرتے ہیں کہ جنہوں نے ان کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں اور ان کے ثبوت میں اس طرح دلائل دیے ہیں جس طرح ایک سائنس دان

دیتا ہے۔ اس لحاظ سے علامہ قدرتی سائنس کے ماہر کی طرح مذہبی یا مابعد الطبیعیاتی معاملات پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی سوچ کا یہی انداز انہیں دیگر مفکرین سے جدا کرتا ہے اور اسی سوچ کی بنا پر انھوں نے مسلمانوں کو فکر و عمل کی دعوت دی اور ہر اس چیز کو حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو انہیں ایک طرف تو مضبوط قوم بنا دے اور دوسری طرف انہیں راہِ حق پر بھی قائم رکھے۔

موجودہ صدی کے چوتھے عشرے تک کوئی بھی اس امر کا ادراک نہ کر سکتا تھا کہ سائنسی ترقی ایک دن دنیا کا اوڑھنا بچھونا بن جائے گی۔ ہر قوم اپنے آپ کو سائنس کے توسط سے بلند تر سطح پر لے جانا چاہے گی تاکہ وہ فوجی اور معاشی لحاظ سے خود کفیل ہو کر غاصبوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہو سکے۔

علامہ کے زمانے میں جس چیز نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا وہ اس کا سامراجی اور معاشی نظام تھا جس کے بل پر مختلف ملک اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ علامہ نے وقت کے اس اہم مسئلے کو دیکھنے کے بعد کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور علامہ کے افکار کا جائزہ اگر اسی تناظر میں لیا جائے تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہلاکت آفریں اور فلاح و بہبود کے پہلوؤں پر بھی اپنے مخصوص انداز سے بالکل اسی طرح اپنا قلم اٹھاتے جس طرح انہوں نے معاشی نظام پر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اٹھایا تھا۔

علامہ اقبال بنیادی طور پر ایک سائنس دان کے بجائے ایک فلسفی تھے اور شاعری ان کا پسندیدہ ذریعۂ اظہار تھا۔ یہ ذریعۂ اظہار چونکہ دلکش اور جامع ہے لہٰذا حضرت علامہ نے ہر طرح سے اسے بامقصد بنا کر اپنے افکار و خیالات پوری شاعرانہ آب و تاب کے ساتھ بیان کیے۔ انہوں نے امتِ مسلمہ میں موجود خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر بھی کیا اور ان کے ہمہ جہتی اسباب کا بھی جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے درخشاں ماضی کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بھی کہا کہ ہمیں کیسا ہونا چاہیے؟

ان سب امور میں سے کچھ کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے اور کچھ کا بیرون سے۔ کہیں روحانی طاقت درکار ہے اور کہیں مادی طاقت۔ روحانی طاقتوں میں عشق و مستی اور جذبۂ ایمان شامل ہیں تو مادی طاقتوں میں سامانِ حرب و ضرب جو روحانی طاقتوں کے کچھ اس طرح تابع ہیں کہ اگر جذبے نے ساتھ نہ دیا تو یہ تردد تفنگ کیا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے ایمانی طاقت پر زیادہ زور دیا اور اپنے پورے کلام میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

اب رہا یہ سوال کہ ایک مردِ مومن میں یہ دونوں طاقتیں کس طرح پیدا ہوں تو اس سلسلے میں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ جذبۂ ایمان زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہے۔ یہ جذبہ جس طرح پہلے پیدا ہوتا تھا اسی طرح آج بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ جہاں تک بیرونی عناصر کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جب علامہ عدالت اور شجاعت کا سبق دیتے ہیں تو پھر یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے اس کا نام مادی قوت ہے۔ مادی قوت کس طرح حاصل ہوتی ہے یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں علامہ کے افکار میں جو "سائنسی تعلیم کے حصول" جیسے الفاظ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ علامہ کے کلام کا مطالعہ ان کے ذہن کے جس رُخ کی نشاندہی کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دائرۂ اطاعت میں رہ کر مسلمان ہر وہ کام کریں جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کر دے۔ ان کاموں میں وہ تعلیم بھی شامل ہے جس کے حصول سے فوجی برتری بھی حاصل ہو اور صنعتی ترقی بھی۔

جہاں تک صنعتی ترقی کا تعلق ہے، علامہ اس کے مثبت اور منفی ہر دو پہلوؤں سے آگاہ تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مشینی دور کو دیکھ کر برملا کہا کہ مشین انسان کو مروّت سے عاری کر سکتی ہے اس میں شک نہیں کہ انسان ماحول کو جنم دیتا ہے اور ماحول انسان کو اپنے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ مشینی دور میں انسان کا مشین کی طرح ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ علامہ نے اس جانب اشارہ کر کے صنعتی ترقی کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ان اثرات سے خبردار کیا جو مشینی زندگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب انھوں نے لینن کو خدا کے حضور کھڑا کر کے اس کی زبان سے اہلِ مغرب کے لیے وہ کچھ کہلوایا جو سب کا سب اس معاشی نظام کے خلاف ہے۔ جس نے ایک قوم کو دوسری قوم کا غلام بنا رکھا ہے۔ برق و بخارات کے الفاظ سائنس کے حصول کی مخالفت میں نہیں ہیں بلکہ یہ اس طاقت کے خلاف ہیں جس کے تحت سرمایہ دارانہ نظام میں کمزور کی سزا مرگِ مفاجات قرار دی گئی۔ اس طرح ان کے نزدیک سودی نظام نے مذہبی و اخلاقی تعلیم کو بے بس کر دیا کیونکہ ایک دوسرے سے بے حسی سودی نظام پر مبنی مغربی سرمایہ داری کا شعار کا درجہ رکھتی ہے۔

سائنسی ترقی کے ذیل میں انسان جو کچھ آج تک کر پایا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے قدرت کے بنائے ہوئے اس نظامِ قوانین کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جن کے تحت حیوانات، نباتات،

جمادات، نیز کائنات کی وسعتوں میں اپنے اپنے محور پر حرکت پذیر اجرامِ فلکی وجود میں آتے ہیں۔ انسان نے اپنی جانب سے جو ایجادات اور اختراعات کی ہیں وہ سب مظاہرِ قدرت ہی سے ماخوذ ہیں۔ اپنی جانب سے وہ ان میں نہ ذرّہ بھر اضافہ کر سکا ہے اور نہ کمی اور نہ ہی وہ کسی زندہ چیز کو وجود میں لانے کا کوئی طریقہ جان سکا ہے۔

انسان کائنات کے اسرار و رموز کو جس قدر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اسی قدر خدائے برتر کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ سائنسی ترقی جس قدر زیادہ ہو اسی قدر وہ انسان کو اپنے ہیچ ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ رموزِ کائنات کے بارے میں معمولی سے معمولی واقفیت بھی انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اور حیرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو خدا کی عظمت کا قائل کرتی ہے۔

مثال کے طور پر انسانی تولید اور نشوونما کے بھی کچھ اصول ہیں جن کے مطالعہ کے بعد اگر اعضا کی پیوند کاری یا تبدیلی ممکن ہو رہی ہے تو ان سب کی بنیاد قدرت کے بنائے ہوئے اصول ہی تو ہیں۔ دراصل سائنس کی کوئی بھی چیز قوانینِ قدرت کے دائرے سے باہر نہیں۔

سائنس دانوں کے نزدیک یہ کائنات زمان و مکاں، ہر دو لحاظ سے تغیّر پذیر ہے۔ یہی بات علامہ اقبال جب اپنے فلسفیانہ انداز میں کہتے ہیں تو ان کے نزدیک اس کائنات کا وصف ہی اس کی تغیّر پذیری میں ہے اور اس کی اس مسلسل حرکت ہی کے تحت انہوں نے کائنات کو ناتمام کہا۔ اسی سوچ کو اگر آگے بڑھایا جائے تو علامہ کے نزدیک اجتہاد بھی حرکت پذیری ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان خیالات کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح نکتۂ توحید کو سمجھنے کے لیے دماغ کو خالی از بت خانہ ہونا چاہیے، اسی طرح سائنس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے بھی دماغ کو اوہام کے بت خانوں سے نجات درکار ہے۔ علامہ نے کہیں بھی سائنس کی تضحیک نہیں کی اور پھر ان کے زمانے میں سائنس کی وہ تشکیل و صورت کہاں تھی جو آج ہے۔ علامہ نے اگر تضحیک کی ہے تو ہر اس رجحان کی جو آدمی کو اپنی ذات سے بے خبر کر کے اسے ستاروں کی گزرگاہیں ڈھونڈنے پر لگا دے۔ علامہ ایک روشن خیال انسان تھے۔ انہوں نے بلا لحاظِ مذہب و ملّت ہر اس شخص کو خراجِ عقیدت پیش کیا جس نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے فروغ کے لیے کچھ کام کیا۔ البتہ مسلمان ہونے کے ناتے انہوں نے مسلمانوں کے آبا و اجداد کے کارناموں کا ذکر بالخصوص کیا۔

علامہ کے دل میں اہلِ علم کی اہمیت اس قدر تھی کہ انہوں نے جمہوری طرزِ حکومت پر صرف اس لیے چوٹ کی کہ اس میں اہلِ علم بھی گنتی کی اسی قطار میں کھڑے کر دیے جاتے ہیں کہ جس میں جاہل اور گنوار

کھڑے ہوتے ہیں لیکن علم کے دائرۂ تعریف میں صرف مذہبی علوم کا جاننا ہی شامل نہیں بلکہ ہر اس چیز کا جاننا علم ہے جو قدرت کی پیدا کردہ ہے۔ ان میں بے جان بھی شامل ہیں اور جان دار بھی۔ ان میں ہر دو اقسام کے بیرون کا مطالعہ بھی اہم ہے اور اندرون کا بھی، باہمی تعلق بھی شامل ہے اور اس تعلق سے پیدا ہونے والے اسباب و اثرات بھی۔ کسی علم کو کوئی نام دیا گیا ہے تو کسی کو کوئی۔ ناموں کی اس تقسیم میں ایک ایسا نام بھی وجود میں آیا کہ جسے عرفِ عام میں سائنس کہتے ہیں۔ اور سائنس کے احاطہ میں موجود علوم کا مطالعہ انسان کے لیے ملحدانہ نہیں بلکہ مواحدانہ خیالات کا باعث بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنسی تعلیم و تحقیق اگر مذہبی تعلیم و تربیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو تو مومن کو ایک ہاتھ میں تلوار یعنی قوت عطا کرتی ہے تاکہ وہ کفر سے نبرد آزما ہو سکے اور دوسرے ہاتھ میں قرآن، جس کی تعلیمات سے وہ بنی نوع انسان کو انسانیت کی راہ دکھا سکتا ہے ——— بالفاظِ علامہ:

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

———